کشور ناہید بطور خاکہ نگار

ڈاکٹر عقیلہ بشیر *

Abstract:

Kishwar Naheed is a well known poetess and true feminist in Urdu literature. Her feminist approach is very evident through here work. She has good command of positive criticism. She is considered an important figure among the Urdu writers. The article argues that she has proved her talent in producing beautiful characters.

ادب کی دنیا میں کشور ناہید کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں اگر چہ شاعری ان کا معتبر حوالہ ہے لیکن بطور مترجم بھی وہ جانی جاتی ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ تحقیق کا میدان ہو یا صحافت کا، بچوں کا تخلیقی ادب ہو یا عورتوں سے متعلق تذکرے، ادباء وشعرا کے فن پر سیر حاصل گفتگو کو سپردِ قلم کرنا ہو یا اپنے شوہر کو حرفِ تنقید بنانا ہو، کالم لکھنا ہو یا پھر اپنی ذاتی زندگی میں جھانکنا ہو ہر حیثیت سے انہوں نے اپنے آپ کو منوایا ہے۔

''شناسائیاں رُسوائیاں'' کشور ناہید کی یادداشتوں پر مبنی خاکوں کی کتاب ہے جو سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی۔اس کا انتساب ش فرخ اور شہناز امام کے نام ہے۔سب سے پہلے تو اس کتاب کا عنوان ہی معنی خیز ہے یعنی شناسائی رسوائی کا سبب بنتی ہے۔دنیا میں ہر چیز اور ہر تعلق کی قیمت چکانی پڑتی ہے اور شناسائی کی قیمت رسوائی کی صورت میں چکانی پڑتی ہے۔کشور ناہید کو جاننے والا شخص ان معنوں سے بخوبی آگاہ ہے۔ ۲۲۰ صفحات پر مبنی اس کتاب میں مجموعی طور پر ۳۵ خاکے ہیں۔ان میں سے ۱۵/انفرادی اور ۲۰/اجتماعی ہیں۔اجتماعی خاکے لوگوں کے ساتھ ساتھ کچھ اداروں اور کچھ شہروں پر بھی مشتمل ہیں۔شہر اور ادارے اپنی عادتوں کا تعین اپنے باسیوں کی عادات واطوار کی مدد سے کرتے ہیں۔یہ کتاب جہاں بہت سے لوگوں کی شخصیت کے نہاں خانوں تک

* ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

رسائی کا موجب بنتی ہے وہاں مصنفہ کے اپنی ذات کے گوشے بھی آشکار ہوتے ہیں۔

خاکہ نگاری ایک مشکل فن ہے اور اس فن کو احسن طریقے سے نبھانا مشکل ترین۔ کشور ناہید نے اس فن کے تقاضوں کو نبھایا ہے یہ تقاضے کم وبیش وہی ہیں جن کے متعلق فارغ بخاری نے لکھا ہے کہ:۔

> ''خاکہ نگاری کے تقاضے یہ ہیں کہ جس شخص کی قلمی تصویر کشی کی جائے اس کے اپنے اندر کچھ بھڑ کتے پا گل کر دینے والے رنگ ہوں وارفتہ کر دینے والی خوشبوئیں ہوں۔ قلم کو بے لگام کر دینے والی نفرشیں ہوں۔ خیال وفکر کو بہکانے والا فکر ہو تخلیق کاری میں برہنہ حقیقت نگاری کی جگر داری ہو۔ ایسی کھلی اور روشن فضا ہو جو اسے برداشت کرنے کا بالغ شعور رکھتی ہو۔''(۱)

دراصل ہر ادبی صنف کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر اس صنف کو فن کا درجہ ملتا ہے۔ اس فن کے پیچھے ایک مضبوط روایت ہوتی ہے۔ اردو خاکہ نگاری کی روایت بھی بہت طویل اور مضبوط ہے اس طویل روایت میں جو بڑے نام ہیں انہوں نے مختلف انداز میں کسی شخص کے ظاہری اور باطنی اوصاف کا احاطہ کیا ہے۔ مثلاً آبِ حیات کی صورت میں محمد حسین آزاد کا اردو میں شخصیتوں کا پہلا کامیاب مرقع ہے بعد میں اس فن کو کامیابی سے آگے بڑھانے والوں میں فرحت اللہ بیگ کا نام آتا ہے۔ ''نذیر احمد کی کہانی'' اور پھر ''ایک وصیت کی تعمیل'' آج بھی قاری کو محظوظ کرتے ہیں۔ لگ بھگ اسی دور میں خواجہ حسن نظامی نے بھی دلی کی بہت سی معروف شخصیتوں کے مرقعے پیش کئے تھے۔ شخصیات کے ذریعے ایک عہد کو زندہ کرنے کی کاوش مولوی عبدالحق نے کی۔ بعد میں ان کے منتشر خاکے ان کے شاگرد شیخ چاند نے جمع کر کے چند ''ہمعصر'' کے نام سے ترتیب دیا اور یوں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب بن گئی۔ ۱۹۳۹ء میں دارالاشاعت، لاہور سے چراغ حسن حسرت کی ''مردم دیدہ'' شائع ہوئی۔ یہ محض سات شخصیتوں کا مرقع ہے یہ تمام مضامین دلچسپ ہیں اور اس میں محبت اور الفت کا عنصر غالب ہے۔ اسی دور میں رشید احمد صدیقی بھی اپنا آپ منواتے ہیں۔ ''گنج ہائے گرانمایہ'' تعزیتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس لئے اس میں دردمندی اور دلسوزی پائی جاتی ہے۔

شوکت تھانوی کی ''شیش محل'' کے نام سے مضحکہ خیز تصاویر سامنے آتی ہیں یعنی دو سو تیس صفحات پر ایک سو سترہ شخصیتوں کو اس طرح پیش کیا کہ خود اقرار کیا کہ یہ تذکرہ کسی مؤرخ کے کام آنے والی چیز نہیں۔ لہٰذا ان خاکوں کو سنجیدگی سے نہیں لیا جا سکتا۔ منٹو کی کتاب ''گنجے فرشتے'' شخصیت نگاری کا ایسا مجموعہ ہے جس سے مصنف کی شدید انفرادیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور بقول عابد علی عابد کہ اس کتاب میں بارہ شخصیات کے علاوہ ایک تیرھواں گنجا فرشتہ

بھی ہے جسے سعادت حسن منٹو کہیں گے۔عصمت چغتائی نے بھی چند خاکے لکھے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا قلم بے رحم ہے جو اپنے بھائی کو بھی نہیں بخشتا۔ ۱۹۵۵ء میں مولانا عبدالمجید سالک کی ''یارانِ کہن'' کے نام سے کتاب سامنے آئی جس میں بیس شخصیات پر مضامین ہیں۔ یہ مضامین شخصیات کی جھلکیاں دکھانے کے علاوہ اس عہد کے ثقافتی ماحول کی بھی بڑی اچھی تصویریں دکھاتے ہیں۔ان کے علاوہ اشرف صبوحی کی کتاب ''دلی کی چند عجیب ہستیاں'' خاکوں پر مشتمل دلچسپ کتاب ہے اور تمام تر غیر معروف لوگوں کے خاکوں پر مشتمل ہے اور یہی اس کی انفرادیت ہے۔ضیاالدین امجد کی کتاب ۱۹۴۱ء میں ''عظمتِ رفتہ'' کے نام سے شائع ہوئی۔اس میں ۹۳ خاکے ہیں۔۱۹۶۲ء میں شاہد احمد کی کتاب ''گنجینہ گوہر'' اپنے اندر سترہ خاکے، سمیٹے ہوئے منظر عام پر آئی اور داد پائی۔اس سے ذرا پہلے ۱۹۶۱ء میں محمد طفیل کی کتاب ''جناب'' شائع ہوئی اور دوسری کتاب ''صاحب'' ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ مرزا ادیب، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی نے بھی اپنی اپنی طرز کے خاکے تخلیق کئے۔ نئے لکھنے والوں میں رحیم گل، گلزار وفا چوہدری، اے حمید اور ڈاکٹر انوار احمد کے نام آتے ہیں۔ڈاکٹر انوار احمد کی کتاب ''یادگار زمانہ ہیں جو لوگ'' ان کی بصارت اور بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اس شاندار روایت میں کشور ناہید کی کتاب ''شناسائیاں رسوائیاں'' ایک اہم اضافہ ہے۔اس میں موجود خاکے اور یادداشتیں جہاں کشور ناہید کی انفرادیت کو اجاگر کرتے ہیں وہاں یہ کردار عوامی سطح پر اس قدر جانے پہچانے جاتے ہیں کہ اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔اگرچہ خاکوں سے زیادہ یہ تذکرے لگتے ہیں لیکن مختصر ہوتے ہوئے بھی شخصیت کا وہ رُخ سامنے آتا ہے، جو بھرپور تاثر چھوڑ جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ کشور کردار کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کی دھڑکن کو محسوس کرتی ہیں اور مسلسل دھڑکن کو نظر انداز کر کے اس کی صرف غیر معمولی رفتار کو آشکار کرتی ہیں۔ یوں یہ کردار نہ صرف دلچسپ بن جاتا ہے بلکہ قاری چونک چونک بھی پڑتا ہے۔ٹوٹ بٹوٹ والے صوفی تبسم سے کون سا بچہ ناواقف ہے۔لیکن کشور ناہید نے ان کی حلیہ نگاری اس طرح کی ہے کہ یہ لگتا ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی کبھی نہ کبھی صوفی صاحب کے قدم سے قدم ملا کر ضرور چلا ہے۔مثلاً

> ''حقے کی طرح ان کی لنگی بھی بڑی رنگدار ہوتی تھی۔ جھنگ کی لونگیاں نسواری بارڈر، آتشی گلابی اوپر کا حصہ، گہرا نیلا بارڈر، گہرا سبز اوپر کا حصہ اس کے اوپر ململ کا کرتہ اور پیر میں تلے والا کھسہ۔سر پر ہاتھ پھیرنا اور دوسروں کے علاوہ اپنے بھی شعروں کو جب کوئی اچھا گانے والا سنا رہا ہوتا تو وہ بے ساختہ رو پڑتے تھے۔''(۲)

فیض جو متنازعہ شخصیت بھی رہے۔کشور ناہید نے گھر کے اندر اور گھر کے باہر فیض کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے اور ساقی فاروقی کا نام لئے بغیر فیض کے ن۔م۔راشد کے بارے میں خیالات کی ترجمانی کرتے

ہوئے لکھتی ہیں:

''لوگوں نے بہت کوشش کی فیض صاحب اور راشد صاحب کو لڑوانے کی راشد صاحب برہم بھی ہوتے تھے اور اس بات سے چڑ بھی جاتے تھے کہ لوگ فیض صاحب کو بڑا شاعر ان کے مقابلے میں کیوں کہتے ہیں مگر فیض صاحب سے جب بھی ذکر ہوا وہ ہمیشہ راشد صاحب کی تعریف بھی کرتے تھے اور عزت بھی۔''(۳)

ان کے خاکے سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ فیض صاحب جب بھی شہر سے نکلتے ان کا قیام عموماً اپنی فیمیل دوستوں کے یہاں ہوتا۔ مثلاً کراچی میں آمنہ مجید، اسلام آباد میں سرفراز اقبال، ملتان میں عفت ذکی، لاہور میں ندرت الطاف، لندن میں زہرہ نگاہ۔ دراصل فیض کے اپنے گھر بیوی اور دو بچیاں تھیں خواتین کی موجودگی میں وہ بے تکلفی محسوس کرتے تھے۔ اور ان کی بہن کے بقول ان کی شادی سے پہلے ان کے آبائی گھر میں بھی خواتین کی تعداد زیادہ تھی اور دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں وہ ان کا زیادہ کام کر دیا کرتے تھے۔(۴) لہٰذا ان کے ہاں جو ایک مہذب اور تہذیب یافتہ اسلوب اور رویہ پایا جاتا تھا اس کا سبب یہی تھا۔ ''برگد تلے- پرانے چہرے'' کے عنوان سے بے شمار چہرے ہیں جو پڑھتے ہوئے نئے لگتے ہیں کیوں کہ ان کا یہ روپ اس سے پہلے ہمارے سامنے نہیں آیا۔ مثلاً ایم اسلم کے بارے میں کہ وہ گھر کے پلنگ پر لیٹے سر کے نیچے گاؤ تکیہ رکھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے اور معصومیت سے ہنس رہے تھے اور دیکھنے پر پتہ چلا کہ وہ انکا اپنا ہی ناول تھا۔ یا کشور ناہید کو دیکھ کر منٹو کا حیرت سے کہنا ''صفیہ ایدھر آ'' دیکھ برقعے وچ کڑی آٹو گراف لین آئی اے''۔ یا حجاب امتیاز کا امتیاز علی تاج کے قل والے دن بھی وگ لگانا اور میک اَپ میں دِکھنا۔ اور حاجرہ مسرور کا سگریٹ پیتے ہوئے مسحور کن لگنا اور شوکت تھانوی کا بیٹی کا نام شوقیہ اس لئے رکھنا کہ وہ شوق سے پیدا کی گئی ہے اور مصطفیٰ زیدی کا کشور کو ہزلیات کہنے سے پہلے محفل سے اٹھا دینا۔ اور آدم جی انعام ادا جعفری کو ملنے پر مصطفیٰ زیدی کا ادا کے خلاف ہزل لکھنا، حبیب جالب اور شورش کاشمیری کے درمیان ٹولنٹن مارکیٹ میں لڑائی اور ایک دوسرے پر گھی کے ڈبے پھینکنے کا منظر، سبطِ حسن کا حیدر آباد دکن کی بیگمات کا دلارا ہونا۔ ملکہ پکھراج کا ٹھسے سے رہنا۔ عبدالرحمٰن چغتائی کی دریا دلی، اشرف صبوحی کا گنگا جمنی میں دُھلی اُردو بولنا۔ پروین شاکر کا کاٹنوں کے حساب سے داد وصول کرنا۔ سید وقار عظیم اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کا سلیقے سے بڑھاپا گزارنا، عابد علی عابد کی حوصلہ افزائی۔ فہمیدہ ریاض سے دوستی کے اتار چڑھاؤ کے علاوہ بے شمار شخصیات ہیں جن کے متعلق چند جملے لکھے ہیں مگر ان چند جملوں میں وہ شخصیات کئی ماہ و سال جی گئیں اور ساتھ ہی قاری ان سے شناسائی کے مراحل چند لمحوں میں طے کر گیا۔

''میں نغمہ گر ہوں'' کے عنوان سے نور جہاں کا خاکہ بہت خوبصورت ہے ابتدا میں کشور ناہید کا لائف سٹائل بھی سامنے آتا ہے کہ کس طرح ہر کسی کے لئے ان کا در وا تھا۔ ۱۹۵۱ء کے زمانے میں نور جہاں کا ایثار ہمیشہ زبان زدِ عام رہا یہاں اس کی بھرپور ترجمانی ہوئی ہے۔ اور اس بیان کی صداقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ''میڈم نے کبھی پاکبازی کی نہ قسم کھائی اور نہ کوئی صفائی پیش کی اور نہ کبھی سچ کو قبول کرنے میں تامل کیا۔ البتہ جن لوگوں نے ان کے پیچھے یہ اعلان کیا کہ میڈم ان کے عشق میں مبتلا ہیں۔ بس یہ کافی ہوتا تھا، میڈم کو جوتی اتار جی بھر کے مغلظات سنانے میں چاہے وہ کوئی خوبصورت شاعر ہو کہ سیاست دان۔''(۵)

پورے خاکے میں نور جہاں کے لئے کشور ناہید کی محبت اور عقیدت چھلکی پڑتی ہے وہ میڈم کی کمزوری کا ذکر بھی اس طرح کرتی ہیں کہ وہ لغزش سے زیادہ معصومیت میں ڈھل جاتی ہیں اور کشور کا یہ کہنا کہ ''میں کتنی دولت مند ہو جاتی تھی ان بلاؤں سے'' ظاہر کرتا ہے کہ میڈم کی دوستی کا تفاخر انہیں حاصل تھا۔

مختلف ادیبوں کے بارے میں ''بہت قریب سے دیکھا'' کے عنوان سے اپنے احساسات رقم کئے ہیں۔ یہ باقاعدہ خاکے کی ذیل میں تو نہیں آتے مگر لکھنے والے کے جذبات کی ترجمانی بہت اچھے انداز میں کرتے ہیں مثلاً یہ پتہ چلتا ہے کہ شہزاد احمد سے وہ شاکی ہیں لیکن پسِ پردہ یہ خواہش موجود ہے کہ سرد مہری میں خاموشی اور درگزر بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ گفتگو مغلظات میں ملبوس ہو جائے۔ شاد امرتسری نشے کے زیرِ اثر گفتگو میں مٹھاس برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اور بالآخر اس خانہ خراب نے انہیں میانی صاحب کے قبرستان میں پہنچا کر دم لیا۔ عدم صاحب ڈپٹی آڈیٹر جنرل ہونے کے باوجود پہلی کو اپنی پوری تنخواہ چیلے شراب نوشوں میں تقسیم کر کے دفتر سے قرض لے کر گھر والوں کو دیتے تھے۔ اقبال ساجد جو اپنے بچوں کے لئے غزلیں بیچ کر روٹی کماتا اور جو بچتا وہ شراب پی کر بے ہوش ہو جانے پر خرچ کرتا۔ ''سُن ونجلی دی مٹھری تان'' لکھنے والا احمد راہی جب موجودہ دور کے تقاضے نہ نبھا سکا تو فاقے کی نوبت آئی۔ مگر ''میری ویل دی قمیض جیسے مبتذل گانے نہ لکھ سکا۔

کرشن نگر اور وہاں بسنے والے ادیبوں کا ذکر جب ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ وہ اس وقت کا علامہ اقبال ٹاؤن تھا۔ لیکن تعلقات میں کہیں زیادہ امیر و مہذب۔ جہاں ناصر کاظمی، نذیر ناجی، احمد بشیر، پروین عاطف، احمد مشتاق، انجم رومانی، منو بھائی، جاوید شاہین، مرزا منور اور مرزا ادیب جیسے اہلِ قلم بستے تھے۔ شاکر علی کا ذکر وہ ''دل کی چڑیا'' نامی باب میں کرتی ہیں۔ شاکر علی سنسر بورڈ کے ممبر تھے اور کمال کے مصور۔ ذوالفقار علی بھٹو ان کے مداحوں میں سے تھے۔ شاکر علی کے جس آرکیٹکٹ ڈیزائن کے گھر کا ہمیشہ چرچا رہا اس کا ذکر بھی اس باب میں ملتا ہے کہ کس طرح وہ اینٹوں کے بھٹے پر جا کر جلی ہوئی ٹیڑھی ٹیڑھی اینٹیں نکال کر الگ کرتے تھے۔ اور دروازوں اور لائٹوں کا

انوکھا انداز نکالا اور اس گھر کی باقاعدہ دستاویز فلم بنی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں جب ادیب اور شعراء جنگی ترانے لکھ رہے تھے اس وقت اس مصور کی سوچ یہ تھی کہ ''مجھے لڑائی میں کوئی دانشمندی نظر نہیں آتی'' یہ سوچ اس وقت شاید بری محسوس ہوئی ہو مگر بعد میں بہت مثبت لگی۔ قرۃ العین حیدر کے بارے میں لکھتے ہوئے کشور ناہید خود شوخی کرتی ہوئی نٹ کھٹ لڑکی کا کردار ادا کرتی ہیں۔ اسی لئے قرۃ العین حیدر پر ان کا ترکش کام کر جاتا ہے ورنہ وہ بھلا کب قابو میں آنے والی تھیں۔ ان پر لکھا بظاہر ہلکا پھلکا مضمون بھی قرۃ العین حیدر کے کئی گوشوں کو ہمارے سامنے یوں لاتا ہے کہ قاری آنکھیں جھپکتا رہ جاتا ہے۔

ریڈیو پاکستان لاہور کے حوالے سے جب وہ اپنی یادیں تازہ کرتی ہیں تو اپنے ساتھ قاری کی بے شمار لوگوں سے ملاقات کرواتی ہیں اور اس ڈھنگ سے کہ مانوس لوگوں کی محفل سج جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ موہنی حمید ہمارے سامنے بیٹھی گا رہی ہیں۔ ''مُنے میری گڑیا چھوڑ، چھوڑ دے مُنے یہ نہ توڑ'' امانت علی خان شاعروں کی منڈلی میں آج بھی بیٹھا ایمانداری سے اپنا پوا استعمال کر رہا ہے اور اقبال بانو کی محفل میں ہر پڑھنے والا خود کو نعرہ لگاتا ہوا محسوس کرتا ہے جب اس نے فیض کا کلام گایا تھا ''لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے'' اقبال بانو، فریدہ خانم، زاہدہ سلطانہ، منور سلطانہ، زبیدہ خانم اور ان جیسی بے شمار فنکارائیں جنہوں نے شادی کی اور ان کے شوہر اور بعد میں بیٹے ان کے فن کے ناخدا بن بیٹھے۔ شاید ہی کبھی ان سے کسی نے پوچھا ہو کہ شادی کرنا مشکل ہے یا اپنے فن کی قربانی دینا۔ جن کے لئے فن کی قربانی دینا مشکل تھا انہوں نے رشتہ توڑنے میں عافیت جانی لہٰذا ناہید صدیقی اور ضیا محی الدین کا رشتہ ٹوٹا، شیما کرمانی اور خالد کا رشتہ ختم ہوا۔ طاہرہ سید اور نعیم بخاری الگ ہوئے، نگہت چودھری اکیلی رہ گئی۔ مہناز نے کسی کو قبول ہی نہ کیا۔ اور بھی بے شمار نام ہیں جنہوں نے فن کو ہی غنیمت جانا۔ جمیلہ ہاشمی سے اپنی دوستی اور تعلق کی وضاحت بہت خوبصورتی سے کرتی ہیں۔ آج کا قاری جمیلہ ہاشمی کی بیٹی ڈاکٹر عائشہ صدیقہ سے زیادہ متاثر ہے اور یہ خاکہ پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر عائشہ صدیقہ آج جب گفتگو میں عقلیت اور استدلالیت کا ثبوت دیتی ہیں تو شاید اس کی یہ بھی وجہ ہو کہ بچپن میں انہیں جس بکری کا دودھ پلایا جاتا تھا اس بکری کی تواضع قلاقند سے کی جاتی تھی۔ اور جمیلہ ہاشمی کے شوہر اویسی جب مریدوں میں ہوتے تھے تو تعویز بانٹتے تھے اور جب دوستوں میں ہوتے تھے تو بیئر کا سلسلہ چلتا تھا۔ لیکن بیان ایسا ہے کہ یہ دونوں روپ قابلِ قبول ہیں اور انگلی اٹھانے کی گنجائش نہیں۔

انتظار حسین کو عزت اور محبت تو کشور ناہید نے دو صفحوں کے خاکے میں ضرور دی مگر جس رفاقت کے وہ حقدار تھے وہ انہیں یہاں بھی میسر نہ آئی۔ دیکھیں انتظار حسین کس حد تک صابر اور شاکر رہتے ہیں۔ فراز کا خاکہ پڑھیں تو یوں لگتا ہے جیسے کشور ناہید یوسف کامران کی پرچھائیں کا تعاقب کر رہی ہیں اور اس جملے میں ایک کسک سی

محسوس ہوئی جب وہ لکھتی ہیں ''ابھی بھی فراز کے معمولات اور شام بسری میں فرق نہیں آیا'' اس کے ساتھ ساتھ فراز کی بیوی کی ثابت قدمی اور خاموشی کو سراہتی بھی ہیں۔ یہ الگ بات کہ فراز کے ساتھ جو بھی رہا اسے اپنی قیمت آپ چکانی پڑی۔

حبیب جالب پر لکھتے ہوئے دیگر فنکار بھی زیرِ بحث آتے ہیں جس سے بیان مزید دلچسپ ہو جاتا ہے کیوں کہ کم سہی مگر جالب نے فلمی گانے بھی لکھے ہیں اور فلم ''زرقا'' کے لکھے گئے گانے تو بہت مقبول ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ چند تلخ حقائق بھی پیش کئے ہیں یعنی ''جالب صاحب کے معمولات میں جیل جانا شامل تھا، مضحکہ خیز مقدمات کا سامنا کرنا، گھر والوں کا مادیت پسند ہونا۔ حفظانِ صحت کے اصولوں کو تج کر زندگی گزارنے کا انداز لیکن یہ سب بیان کرنے کا سلیقہ اپنی جگہ۔

ریڈیو اسٹیشن، لاہور کی طرح کا ایک خاکہ پی ٹی وی، لاہور کے عنوان سے بھی شامل کیا گیا ہے۔ ایک زمانے تک پی۔ٹی۔وی نے پاکستانیوں کے دلوں پر راج کیا۔ ڈراموں کے اوقات مدِ نظر رکھ کے لوگ اپنی سرگرمیوں کو ترتیب دیتے تھے اور کھانے پینے کے اوقات مقرر کرتے تھے۔ حسینہ معین، فاطمہ ثریا بجیا، محمد نثار حسین، اشفاق احمد، یونس جاوید، نورالہدیٰ شاہ جیسے لوگوں کے ڈرامے نظر انداز کرنا آسان نہ تھا اور فنکاروں کی ایک ایسی کھیپ میسر تھی جو حقیقت میں محنت کرنا جانتے تھے اور انہیں محنت کی بجا داد بھی ملتی تھی۔ کشور ناہید نے ان لوگوں سے جو انٹرویو کئے اس کے سحر سے آج تک نہیں نکل پائیں۔

یوسف کامران کے حوالے سے خاکے کا عنوان ''رنجشوں کا رفیق'' بہت معنی خیز ہے۔ یہ عنوان ان کی پوری ازدواجی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ ان کی زندگی پر منیر نیازی کی یہ نظم صادق آتی ہے جس کا عنوان ہے ''ان لوگوں سے خوابوں میں ملنا ہی اچھا رہتا ہے۔

تھوڑی دیر کو ساتھ رہے کسی دھندلے شہر کے نقشے پر
ہاتھ میں ہاتھ دیئے گھومے کہیں دور دراز کے رستے پر
بے پردہ استحصانوں پر دواڑتے ہوئے گیتوں کی طرح
غصے میں کبھی لڑتے ہوئے کبھی لپٹے ہوئے پیڑوں کی طرح
اپنی اپنی راہ چلے پھر آخرِ شب کے میداں میں
اپنے اپنے گھر کو جاتے دو حیراں بچوں کی طرح (۶)

لیکن کشور ناہید کی ضد نے اس خواب کو حقیقت بنایا۔ اور آخر میں انہیں یہ کہنا ہی تھا کہ ''بھولنے کے لئے ایک لمحہ بھی

گراں ہوتا ہے یاد رکھنے کے لئے ایک عمر نا کافی ہوتی ہے۔(۷)

پاکستان کے مصوروں کا ذکر کرتے ہوئے کشور ناہید اس تذکرے کو جلد از جلد ختم کرتی اور کترا کر گزرتی چلی جاتی ہیں لگتا ہے یہ ان کی دکھتی رگ ہے۔منو بھائی یہ بتاتے رو پڑتا ہے کہ اب صادقین گیلری کی جگہ شادی گھر قائم ہے۔منو بھائی کے آنسوؤں کی نمی ہم اپنے حلق میں بھی محسوس کر سکتے ہیں۔لیکن ہندوستان میں مصوری کے حوالے سے جب بات کرتی ہیں تو ایک سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔وہاں آرٹسٹ کو من پسند ماحول ملتا ہے اور صحیح معنوں میں ان کی قدر کی جاتی ہے تو پھر اس فن کو فروغ کیوں نہ ملے۔اور آخر میں وہ جوش سے کہتی ہیں:

''ہندوستان تو بھرا پڑا ہے آرٹسٹوں سے، میری کم مائیگی کہ میں ہی چند آرٹسٹوں کو جانتی ہوں۔''(۸)

اس کے علاوہ لاہور کے طباعتی اداروں کی حقیقت سے روشناس کراتے ہوئے صرف سنگِ میل والوں کی تعریف ملتی ہے۔'عالم گردی' کے تحت مختلف ملکوں کے کچھ کرداریوں سامنے آتے ہیں کہ اپنی ایک ایک جھلک دکھا کر گزر جاتے ہیں لیکن ہر نقش کافی دیر تک اپنا عکس برقرار رکھتا ہے۔

افتخار عارف اور احمد فراز کا دوستی سے اجنبیت تک کا سفر معنی خیز ہے۔اسلام آباد جیسے شہر میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں کہ انسان انسان سے کم گریڈ سے زیادہ پہچانا جاتا ہے لہٰذا رقابت انسانوں کے درمیان نہیں بلکہ گریڈوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔

'گنگا کنارے' میں یوں تو بے شمار شخصیات سے تعارف کروایا گیا ہے مگر سب سے زیادہ دلچسپ ذکر اجیت کور کا ہے۔اجیت کور سے بیک وقت محبت اور نفرت کے رشتے کی آمیزش سامنے آتی ہے۔اس میں کشور ناہید کا قصور نہیں وہ جو لکھتی ہیں کہ سچ اکثر کڑوا لگتا ہے اور پھر اتنا اوکھا سچ۔تو یہ بات ہر دو جانب صادق آتی ہے۔ساقی گری میں ساقی فاروقی کی شخصیت پوری طرح کھلنے نہیں پاتی۔لیکن یہ شخصیت تو پاپ بیتی میں بھی پوری طرح عیاں نہیں ہوئی۔اس لئے کشور ناہید کو بری الذمہ قرار دینا پڑتا ہے۔کراچی میں ہاتھوں ہاتھ لینے والی بے شمار ایسی ہستیاں ہیں جن کا مصنفہ پر قرض ہے اور وہ محبتوں کا شمار نہیں کر پاتی۔اور باری باری ہر کسی کا دامن پکڑ کر خوشی خوشی متعارف کرواتی جاتی ہے۔ان میں انیس، نوشابہ ش فرخ، اطہر نفیس، فاطمہ حسن، صہبا لکھنوی، محمد علی صدیقی، فرمان فتح پوری، راحت سعید، واحد بشیر، تنویر انجم، فہمیدہ ریاض، زہرہ نگاہ، مشتاق یوسفی، جمیل جالبی، مشفق خواجہ، عالی اور بے شمار لوگ اپنی شخصیت کے توانا رنگوں سمیت موجود ہیں۔

جیئے بھٹو کی بازگشت میں اگرچہ سیاسی ذہن کی کارفرمائی سامنے آتی ہے مگر مجھے تو یوں لگتا ہے کشور ناہید اپنا

فیمینسٹ ہونا یہاں بھی نہیں بھولیں۔ خصوصاً نصرت بھٹو کے حوالے سے ان کی سوچ ایک عورت سے ہمدردی کا بھرپور اظہار ہے۔ بھٹو کی ذہانت اور دیانت کا اقرار تو بے شمار لوگ کرتے ہیں اور ان سے محبت کا دم بھی بھرتے ہیں مگر ان کی چند حماقتوں کا ذکر اس طرح سے کرنا کہ محبت اور عقیدت پر حرف نہ آئے قابلِ تحسین ہے۔ ''شاعروں کی طرح داریاں'' میں شعراء کی حالتِ زار کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ پڑھتے ہوئے کہیں آنکھ نم ہو جاتی ہے اور کہیں بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے لیکن حیرت اس پر ہوتی ہے کہ کشور ناہید جیسی خاتون جو مردِ آہن کا مقابلہ کر سکتی ہے بے کس شاعر کے بڑھے ناخن تراشتی ہے اور کہیں شاعر کا متعفن کمرہ صاف کرتی ہے اور کہیں آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں یہاں کشور ناہید محبت بانٹنے والی اور اخلاص برتنے والی ہستی کے روپ میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہیں ''عورتوں کی مسافت'' دراصل کسی ایک مخصوص عورت کی مسافت نہیں بلکہ اس میں عورت مجموعی طور پر ایک کردار کی صورت میں اجاگر ہوتی ہے۔

یہ عورت کہیں گھر والوں کے لئے نوکری کرتی سامنے آتی ہے اور کہیں سڑک پر سیاسی جلسے کرتی۔ کہیں مساوات کے لئے آواز بلند کرتی اور کہیں کالے قوانین کے خلاف جلوس نکالتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ عورت کی یہ جدوجہد اس کی پیدائش سے شروع ہو کر قبر تک مسلسل ایک سفر کی صورت میں اس کے ساتھ ساتھ ہے۔ انجام اسے خود معلوم نہیں۔

''اسلام آباد کا منظر نامہ'' اسلام آباد اور اس کے باسیوں پر لکھا گیا ہے۔ رشید امجد کا افسانہ'' گملے میں اُگا ہوا شہر'' بھی اسلام آباد کے پس منظر میں لکھا گیا ہے جس میں ایک تکلیف دہ واقعہ کو علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے لیکن کشور ناہید نے اس باب میں بہت سی باتیں کھل کر بیان کی ہیں۔ اگر مختصراً کہا جائے تو یہ کہ اس شہر کی ننگی حقیقت بیان کی ہے۔ صحافت اور زبانوں کے میدان سے گزرتی ہوئی بالآخر کشور ناہید فلمی ستاروں کی دنیا میں داخل ہوتی ہیں اور ضیاالحق کے دور کے سنسر کے تماشے مزا لے لے کر بیان کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اداکاراؤں کی کسمپرسی، فاقہ حالی، رہن سہن، معاشقے، شادی بیاہ اور طلاق یا علیحدگی کے واقعات تو رقم نہیں کرتیں مگر اشاروں میں رمزیت پنہاں ہے۔

آخر میں تان ٹوٹتی ہے زندگی سے مکالمے کی صورت میں۔ زندگی گزارنے کے لئے ہمارے آس پاس دوستوں کا ہونا ناگزیر ہے اور انہی دوستوں سے انجان بھی رہتے ہیں تب ہی زندگی دوستوں کے بارے میں سوال کرتی دکھائی دیتی ہے اور زندگی گزارتے ہوئے قدم قدم پر ملے افراد پر دوست کا گمان ہوتا ہے اور کشور آخر میں اس بات کا اقرار کرتی ہیں کہ چالیس برس ساتھ چلنے والوں کو دوست ہی کہا جائے گا اور دوست سے ہی انسان پہچانا جاتا

ہے تو اگر میں بری تو میرے دوست بھی برے۔ اب اتنی سی بات پر نئے دوست تو نہیں بنائے جاسکتے۔ دوسرے لفظوں میں دوست ان کی شناخت ہیں اور ان کی ذات کا ایسا حصہ جسے وہ خود سے جدا کر ہی نہیں سکتیں اور یہ ان کے بڑا ہونے کی دلیل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فارغ بخاری، دوسرا البم، آئینہ ادب، چوک انارکلی، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۶

۲۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۲

۳۔ ایضاً، ص ۲۶

۴۔ اختر جمال، بھائی کی کہانی، بہن کی زبانی، مشمولہ: خونِ دل کی کشید، مرتبہ: مرزا ظفر الحسن، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۳ء، بارِ اوّل، ص ۳۶

۵۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں، ص ۴۹

۶۔ کلیاتِ منیر، چھ رنگیں دروازے، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۸ء، بار سوم، ص ۲۶

۷۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں، ص ۱۱۹

۸۔ ایضاً، ص ۱۲۸